پهلا محاضره علميه

برموضوع

اسلام اور سیاست

ترتیب

محمد حسنین ارشد القاسمی

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

باهتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند

بابت ۱۴۳۵ھ

پہلا محاضرہ علمیہ

برموضوع

اسلام اور سیاست

محمد حسنین ارشد القاسمی

استاذ دار العلوم وقف دیوبند

حجۃ الاسلام اکیڈمی، دار العلوم وقف دیوبند

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

یقیناً مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور خاص طور پر علم دین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس وقت ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، ہمارے لئے اس میں سب سے بڑا چیلنج دینی اقدار، دینی روایات، عقائد اور اسلامی فقہ کے میدان میں ان مسائل کا حل اور جواب تلاش کرنا ہے جو ان بڑے بڑے انقلابات نے پیدا کئے ہیں، جس سے کئی بڑے بڑے میدان کھل گئے ہیں، اس میں علماء کو اپنی بھر پور صلاحیتیں لگانے کی ضرورت ہے اور یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے میدان ایسے حالات میں کھلے جب مسلمان اپنی تاریخ کے زوال پذیر دور سے گذر رہے تھے۔ ہمارے اسلاف کے زمانے میں جب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ائمہ مجتہدین کو حالات سے واسطہ پڑا، اس وقت یونان کا فلسفہ آیا تھا، علماء اس کے جوابات دیتے تھے، نئی حکومتیں اور نئی فتوحات ہوئی تھیں، فقہی مسائل کے نئے میدان کھلے تھے، ان کے جوابات دینے کے لئے نابغۂ روزگار ہستیاں موجود تھیں، فقہاء، مجتہدین موجود تھے، ابومنصور ماتریدیؒ، فخر الدین رازیؒ اور امام غزالیؒ جیسے اللہ والے مفکرین موجود تھے۔

لیکن آج امت اپنے زوال کے دور سے گزر رہی ہے۔ علماء میں بھی وہ صلاحیتیں اور جسمانی طاقتیں نہیں ہیں، اُس درجے کا اخلاص وتقویٰ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ لیکن اللہ کو یہ دین قائم رکھنا ہے، ہر زمانے میں اُمت کے اندر ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی جو ان مسائل کا اسلامی حل اُمت کے سامنے پیش کرتے رہیں گی۔

ان میں ایک میدان سیاست کا میدان ہے، لیکن جب ہم سیاست کا نام سنتے ہیں تو ہمارے

ذہنوں میں سیاست کا جو تصور آتا ہے وہ بہت غلط ہے۔ اس میں جھوٹ، وعدہ خلافی، ایک دوسرے پر الزام تراشی، حکومت سازی کے لئے چال بازی اور دھوکہ دہی شامل ہے، لمبے چوڑے عوام سے جھوٹے وعدے، خودغرضی وغیرہ بھی لازمی طور پر آتی ہے اور یہ تصور موجودہ سیاست کے پیش نظر بالکل صحیح ہے اس لئے کہ آج ہم اس قسم کی سیاست کا تجربہ اور مشاہدہ کر رہے ہیں گویا سیاست ایک گندہ کھیل ہے اور گھناؤنا عمل ہے۔ ہمارے ہندوستان میں یہ کھیل کچھ زیادہ ہی گھناؤنا بنادیا گیا ہے یہاں تک کہ کسی شریف باوقار سنجیدہ شخص کے بارے میں جب سنا جاتا ہے کہ وہ سیاست میں ہے تو ہمارے دلوں میں ان کی عزت کم ہوجاتی ہے، ہم سیاست کو ان کی بلند شان اور اعلیٰ مقام کے منافی تصور کرتے ہیں خاص کر اگر کوئی دیندار صالح مزاج عالم دین سیاست میں حصہ لیتا ہے تو ہمارا تکدر انتہاء کو پہونچ جاتا ہے کیونکہ ہماری نگاہ میں سیاست کا دین سے کوئی ربط نہیں ہے سیاست خالص دنیاوی معاملہ بن گیا ہے جس میں مکروفریب، جھوٹ، فساد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ سیاست نام ہے بدعنوانی اور بدعہدی کا، ذخیرہ اندوزی اور اقربا پروری کا، عوام کے جذبات سے کھیلنے اور منافرت پھیلانے کا، سیاست نام ہے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا، آج کے سیاستداں اور ماہرینِ سیاست اربابِ اقتدار بڑے شدومد کے ساتھ کہتے ہیں کہ سیاست کا مذہب سے کوئی جوڑ نہیں، دونوں کو الگ الگ رکھنے میں ہی بھلائی ہے، لیکن اسلام اور سیاست کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں تاکہ یہ بات متعصبین کے سامنے آجائے کہ سیاست کو اسلام سے جدا کرنا ممکن نہیں، لیکن یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ سیاست کا اسلام سے کوئی ربط نہیں، ہماری آج کی سیاست اپنے اصول وضوابط میں، اپنی طبیعت اور مزاج میں مذہب سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتی تو کیا؟ ایسی گھناؤنی سیاست کو مذہب کے ساتھ جوڑا گیا تو یہ مذہب کی پاکیزگی کو تارتار کرنا ہوگا؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے جدا نہیں کیا جاسکتا، دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں، اسلام نے سیاست کا جو اصول بتایا ہے وہ سیاست انسانی فطرت کے عین مطابق اور شانِ بندگی کے عین موافق ہے[1]۔

[1] اسلام اور سیاست، ص ۶، اسلام کا سیاسی نظریہ، ص ۱۲

جب ہم اسلام کی حقیقت وفطرت پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اسلام ایک جامع نظام زندگی پیش کرتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ کے اصول وضوابط رکھتا ہے، یہ اصول کسی فرد کے نہیں بلکہ خالق کائنات کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں، اسلام کا دستورِ زندگی اپنی جامعیت وا کملیت کے لحاظ سے ممتاز ومنفرد ہے، اسلام نے عوام وخواص، حاکم ومحکوم، امیر وغریب کو ایک سطح پر رکھ کر ان میں خاندانی، قبائلی، نسلی، ملکی تفریق کو ختم کیا ہے، اسلامی سیاست ہر ایک فرد کو اپنے دستور کے تابع بناتی ہے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دیتی، اسلامی سیاست حکمراں طبقہ کو یہ باور کراتی ہے کہ تم بھی قرآن اور آسمانی دستور کے تابع ہو، اسلامی سیاست نہ جمہوریت ہے، نہ اشتراکیت، نہ سامراجیت، نہ بادشاہت بلکہ ایک شورائی نظام پیش کرتی ہے، جس معاملہ میں قرآن وحدیث میں کوئی وضاحت نہیں وہاں قرآن وحدیث کی روشنی میں کسی ایک فیصلہ پر امت کے سنجیدہ اصحابِ بصیرت تجربہ کار افراد کا اتفاق قابل قبول ہوگا، اسلامی سیاست نہ کسی کی آزادی سلب کرتی ہے اور نہ کسی کو بے راہ روی کے لئے آزاد چھوڑتی ہے، اسلامی سیاست ہر حال میں احکم الحاکمین کے احکام کی بالا دستی کو قائم رکھتی ہے، قرآن کے کسی بھی قطعی حکم کو نہ اکثریت رائے تبدیل کرسکتی ہے اور نہ ہی منسوخ کرسکتی ہے[1]۔

سیاست میں نئے نئے نظریات سامنے آئے ہیں، نئے انداز حکومت سامنے آئے ہیں، نئے مسائل سامنے آئے ہیں، علماء اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس میں اسلام کے موقف کو واضح کریں کہ کون سی سیاست اسلامی ہے؟ اور کون سی سیاست ملحدانہ اور کافرانہ ہے؟ اور موجودہ سیاسی نظام جمہوریت کے نام پر یا مختلف ناموں پر چل رہے ہیں، ان میں اور اسلام میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟ اسلام کا نظام حکومت کیا ہے؟ اس کو موجودہ دور میں کیسے اختیار کیا جائے؟

اس طرح کا سوال دوسرے میدانوں میں بھی اٹھتا ہے اور سیاست میں بھی، اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر دے دارالعلوم وقف دیوبند کی انتظامیہ کو کہ انھوں نے حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کے ڈائرکٹر جناب مولانا محمد شکیب القاسمی اطال اللہ عمرہٗ کے پیش کردہ پروپوزل کو قبول فرمایا جس سے ہمارے طلبۂ متخصصین کو جدید موضوعات مثلاً ''لبرالیت، اسلام اور متشرقین، اشتراکیت،

[1] اسلامی نظریہ حکومت، ص۱۳

شیوعیت، اسلام اور سیاست، منہج البحث والتحقیق، اسلامیۃ المعرفۃ'' عالم اسلام کے مشہور مفکرین جیسے اہم موضاعات سے واقفیت پیدا کرائی جائے تاکہ آج کے چیلنجز کا سامنا کرسکے، نیز موڈرن سوسائٹیز کے مسائل ونظریات کا اسلامی حل پیش کرسکیں۔

انھیں مقاصد کے تحت ''اسلام اور سیاست'' کے موضوع پر پہلا محاضرہ کا انعقاد عمل میں آرہا ہے ظاہر ہے کہ موضوع کے ہر ہر پہلو پر مکمل بحث کرنا ممکن نہیں، اس لئے کہ لفظ سیاست جس کو انگریزی میں پولٹیکل سائنس کہا جاتا ہے وہ مستقل ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے اس موضوع پر کئی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، چونکہ ہمارا مقصد طلبۂ مدارس اسلامیہ کو ان مضامین اور موضاعات سے واقفیت پیدا کرانا ہے، تاکہ اس کی روشنی میں وہ اپنے مطالعے میں مزید وسعت پیدا کرسکیں اور جدید موضاعات سے مناسبت بھی، اس پہلے محاضرے میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ لفظ سیاست اور اس کے متعلقات کا اجمالی تعارف اور خلاصہ پیش کردیا جائے اور دوسرے محاضرہ میں انشاء اللہ اسلامی سیاست، اسلامی سیاست کے اصول اور سیاسی شعبوں وغیرہ سے متعلق گفتگو کی جائے گی۔

واللہ الموفق والمستعان

محمد حسنین اُرشد القاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

سیاست کی تعریف

سیاست کی لغوی تعریف

لفظ ''سیاست''، یعنی ایک معاشرے کے بڑے بڑے مسائل ومشکلات کے بارے میں فیصلہ کرنا اور ان کی تدبیر کرنا۔ یہ سرپرستی اس معاشرے کی مشکلات کو رفع کرنے، مختلف امور کو منظّم کرنے، منصوبہ بندی اور اس کے اجزاء کو شامل ہے۔

لغت میں سیاست تدبیر ملکی اور حکمت عملی کو بھی کہا جاتا ہے، ایسے ہی انتظام وانصرام کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسا کہ صاحب المصباح نے کہا: **ساس، سیاسة ای دبره تدبیر قام الامر،** کسی کام کی ذمہ داری لینا، **ساس القوم** لوگوں پر حکومت کرنا۔ سیاست لفظ ''**سوس**'' سے نکلا ہے۔ جس کے لغوی معنی ریاست، پرورش، سزا دینا اور رعایا کے امور کی دیکھ بھال کرنا بھی ہے۔

ابن منظور کہتے ہیں: **السوس الرياسة، يقال ساسوبه سوساً ساس الأمر سياسة قام به.** حکمت عملی اور تدبیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے[۱]۔

سیاست کی اصطلاحی تعریف

سیاست کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں ان میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

(۱) انسانی معاشروں پر حکومت کرنے کے فن کو ''سیاست'' کہتے ہیں۔

(۲) مختلف مسائل کے حل کے بارے میں فیصلہ کرنے کو ''سیاست'' کہتے ہیں۔

(۳) ملکی امور کے انتظام کے لئے حکومت جن تدابیر کو کام میں لاتی ہے انہیں ''سیاست'' کہتے ہیں۔

(۴) اجتماعی امور کو منظّم کرنے کے لئے حکومت جس طاقت کو بروئے کار لاتی ہے اس

---

[۱] لسان العرب ج/٦ ص/١٠٨، القاموس المحيط ص/ ٧١٠، المصباح، ج،۵ ص ٧١٥.

کے علم کو ''سیاست'' کہتے ہیں۔

سیاست کے بہت سے دیگر معانی بھی ہیں بطور مثال: اگر ہم سیاست کے عملی پہلو کو مدنظر رکھیں تو کہہ سکتے ہیں:

(۵) سیاسی قدرت کو حاصل کرنے کے لئے کوشش اور اس کی حفاظت اور تقویت پہونچانا ''سیاست'' کہلاتا ہے۔

اگر ہم سیاست کے فکری اور نظریاتی پہلو کو دیکھیں تو پھر یوں تعریف کر سکتے ہیں:

(۶) سیاسی طاقت حکومتی ڈھانچہ اور سیاسی حکومت میں مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کا مطالعاتی جائزہ، ''سیاست'' کہلائے گا۔

(۷) علم سیاست وہ سماجی علم ہے جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہو۔

(۸) پروفیسر گارنر کے مطابق: علم سیاست وہ علم ہے جو سٹیٹ سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔

(۹) بعض ماہرین سیاست کے لفظوں میں علم سیاست پولیٹکل سائنسی تاریخی تحقیقات ہے اس مسئلہ میں پہلے کیا تھی اور اس وقت کیا ہے؟ اور سماجی واخلاقی بحث ہے اس مسئلے میں کہ کیا ہونا چاہئے[۱]؟

علم سیاست کا موضوع

علم سیاست کا موضوع ریاست کا وجود کس طرح ہوا؟ یعنی اس دنیا میں ریاست کیسے وجود میں آئی؟ کیسے انسانوں کے دل میں پیدا ہوا کہ وہ ایک ریاست بنائیں جس میں کوئی حاکم ہو کوئی محکوم؟ اس بارے میں کیا کیا نظریات دنیا کے اندر مشہور ومعروف ہیں ان تمام چیزوں کا جاننا علم سیاست کا موضوع ہے[۲]۔

---

[۱] اصول سیاست صفحہ ۹، اسلام اور سیاست، ص ۱۵، اسلام اور سیاسی نظریات، ص: ۳۵، اسلامی نظریہ حکومت، ص: ۳۸، اسلام اور اس کا سیاسی نظام، ص ۴۰، اسلام اور سیاسی نظام، السیاسة الشرعیة لِا ابن تیمیہ، ص: ۱۲

علم سیاست کی غرض وغایت

اس دنیا میں کوئی بھی انسان بغیر اسٹیٹ کے نہیں رہ سکتا اور یہ حکومت یا گورنمنٹ اسٹیٹ کا سب سے اہم اور بااختیار شعبہ ہے اور اسٹیٹ ہی میں رہ کر انسان کی زندگی منظّم اور پرامن طریقہ سے گذر سکتی ہے یہ علم سیاست ان تمام چیزوں کو زیر بحث رکھتا ہے اور انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ حالات کے جانے سے شکلیں مختلف ہوجاتی ہے اس لئے اس علم کی ضرورت پیش آتی ہیں[۱]۔

سیاست شریعت کا ایک اہم شعبہ

اس کے متعلق ایک غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ سیاست کو دین وشریعت کا جزو نہیں سمجھتے محض تمدنی امور سمجھ کر اس کا مدار رائے زمانہ کی مصلحت پر سمجھا جاتا ہے، یہ بڑی جہالت ہے کہ لوگ دین نہیں سمجھتے ورنہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام نے سیاست کی تعلیم نہیں دی[۲]۔

دین میں سیاست کی اہمیت

دین کو صرف نماز، روزہ کی حد تک محدود سمجھ کر دوسرے شعبوں سے بالکل غفلت اختیار کرنا بھی بہت بڑی غلطی ہے حقیقت یہ ہے کہ دین کے بہت سارے شعبے ہیں جن میں سیاست بھی ایک اہم شعبہ ہے اور اس سے غفلت اختیار کرکے اسے دین سے خارج سمجھنا بھی بڑی گمراہی ہے، دین پر عمل کے لئے اسلام کے تمام احکام پر عمل ضروری ہے، چاہے وہ کسی شعبہ سے متعلق ہو، البتہ جہاں تک دین کی جدوجہد کا تعلق ہے عادۃً کوئی ایک شخص تمام شعبوں میں جدوجہد نہیں کرسکتا اس لئے اس میں تقسیم کار پر عمل ضروری ہے۔ مثلاً کسی نے اپنے لئے دین کے کام کا شعبہ اختیار کیا، اس میں وہ اپنا وقت اور محنت صرف کررہا ہے اور اس پر زیادہ توجہ دے رہا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، حرج اس میں ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ میں نے جو شعبہ اختیار کیا ہے وہ دین کا مقصود اصلی ہے، بلکہ جس طرح دین کے بہت سے کام ہیں اسی طرح سیاست بھی کام ہے، جیسے کوئی شخص سیاست کے شعبے کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ حالات کے مطابق اس لائن میں خدمت زیادہ بہتر طریقے پر کرسکتا ہے اور اپنے

۱؎ اصول سیاست، ص:۹ ۲؎ اسلام اور سیاست، ص:۱۱

آپ کو اس کام کے لئے لگاتا ہے، لیکن اگر یہ کہے کہ سیاست دین کا مقصود اصلی ہے تو یہ غلط ہے اور اگر کوئی شخص اپنے لئے سیاست کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو وہ بھی عین دین کا ایک حصہ ہے[۱]۔

اسلام نے سیاست کی تعلیم دی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی تعلیم مکمل نہیں تمام معاملات کے متعلق اس میں احکام نہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ شریعت نے صرف عبادات اور معاملات کے تعلق سے ہی احکام بیان کئے ہیں سیاست کے تعلق سے اسلام نے تعلیم نہیں دی، لوگوں کے اس فاسد خیال سے بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگ حد شرعی سے آگے بڑھنے لگے اور ان کا گمان یہ ہونے لگا کہ دین اسلام کی تعلیم ناقص ہے حالانکہ شریعت ایسا پاکیزہ اور مقدس مذہب ہے کہ سیاست کے متعلق کافی قانون اور احکام بیان کی ہیں، حالانکہ کسی دوسرے مذہب کے ضروری احکام تو درکنار رہنے سہنے کے متعلق تعلیم نہیں ملتی، شریعت مطہرہ میں تمام انسانی حالات کے مفصل قواعد موجود ہیں کوئی ایسا جزئیہ نکلنا ممکن نہیں جس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ہو[۲]۔

سیاست کی ابتداء

جب ابتداء میں انسان دنیا میں آیا تو کوئی حکومت کوئی نظامِ دستور نہیں تھا لوگ بغیر کسی حکومت کے اپنے اپنے طور پر انفرادی زندگی گذارتے تھے اس کو فطری حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس میں کوئی حاکم کوئی محکوم کوئی قانون نہیں تھا، کوئی ریاست نہیں تھی، بلکہ ہر شخص اپنی اپنی انفرادی زندگی گذار رہا تھا، اپنے مفاد کے پیش نظر جس طرح چاہتا تھا کام انجام دیتا تھا، لیکن اس حالت میں ایک دوسرے کے مفاد کا ٹکرانا فطری تھا، اس طرح آپس میں جھگڑوں کی بنیادیں پڑی جس کے نتیجے میں ان سب لوگوں نے مل کر سوچا کہ کس طرح ایک ایسا نظام بنایا جائے کہ مفادات کا ٹکراؤ جھگڑوں کا سبب نہ بنے، چنانچہ

۱؎ اصول سیاست، صفحہ ۱۵، اسلام اور سیاست، ص ۱۸، اسلام اور سیاسی نظریات، ص:۳۵، اسلامی نظریہ حکومت، ص:۳۸

۲؎ اسلام اور اس کا سیاسی نظام، ص ۴۰، السیاسۃ الشرعیۃ لا ابن تیمیہ، ص:۱۲

انہوں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا کہ ہم سب کو کسی خاص نظام کے تحت زندگی گزارنی چاہیئے، جس کے نتیجے میں ریاست کا وجود عمل میں آیا ہے، اس معاہدہ کو معاہدہ عمرانی کہا جاتا ہے جو 15 صدی میں معروف ہوا، لیکن اس کا تصور پہلے فلاسفہ کی کتابوں اور ان کی تحریروں سے پایا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ چھوٹے بڑے ہر معاشرے میں کچھ اجتماعی مسائل اور مشکلات ہوتی ہیں کہ جن کے حل کرنے کے لئے اجتماعی فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی حقیقت نے انسان کو ''ریاست وحکومت'' کے قبول کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔ طول تاریخ میں جہاں پر بھی انسانی معاشرہ رہا ہے ''ریاست اور حکومت'' کا وجود بھی اس کے ہمراہ رہا ہے، ہر معاشرے نے چاہے وہ جس شکل میں بھی ہو اپنے اجتماعی امور کی تدبیر کے لئے ایک فرد یا چند افراد کو رئیس، حاکم، امیر، والی، سلطان اور بادشاہ ایسے مختلف عناوین کے تحت قبول کیا ہے۔

علم سیاست کا سیاسی فلسفہ

سیاست کے تحت داخل مسائل بہت مختلف اور متنوع ہیں۔ ''علم سیاست''، ''سیاسی فلسفہ''، سیاسی آئیڈیالوجی'' اور ''سیاسی تجزیہ'' جیسے الفاظ میں سے ہر ایک سیاست کے ساتھ مرتبط مختلف امور کی تحقیقات اور مطالعات کے ایک گوشے کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے بعض مطالعات عملی مباحث کے ساتھ مختص ہیں جبکہ بعض کا تعلق نظریاتی پہلو سے ہے، ان میں بعض کا تعلق عمل سے ہے۔ مثلاً ایک ملک کے سیاسی ماہرین اور سیاستدان جاننا چاہتے ہیں کہ ہمسایہ اور دوسرے ممالک سے تعلقات قائم کرنے میں ان کا موقف کیا ہونا چاہیئے اور عالمی سطح پر بین الاقوامی تعلقات کو کس طرح استوار کریں تو اس کے لئے ان کے پاس عالمی اور بین الاقوامی سطح پر قائم سیاسی اقتدار اور طاقتوں کے متعلق اسی طرح جامع تجزیہ ہونا چاہیئے۔

اس قسم کے سیاسی مطالعات جو عملی پہلو کے حامل ہیں۔ ''علم سیاست''، ''سیاسی تجزیہ وتحلیل'' اور ''لشکری وفوجی مطالعات'' جیسے شعبوں کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں۔ اور ان فنون اور شعبوں پر مسلط ہونا اس قسم کے سوالات اور مسائل کے جواب دینے کے لئے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

دوسری قسم کے سیاسی سوالات اور مسائل کا تعلق علمی اور نظریاتی پہلو سے ہے، عملی پہلو کی نسبت

علمی پہلو عالم سیاست میں بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتا ہے، یہاں پر ہم اس قسم کے چند سوالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟

عوام کے مقابلے میں حکمرانوں کے فرائض کیا ہیں؟

حکومت کے اہداف کیا ہونے چاہئیں؟

حکومت کس حد تک عوام کی آزادی کو محدود کرنے کا حق رکھتی ہے؟

کیا حکومت صرف مادی فلاح و بہبود اور امن وامان کی ذمہ دار ہے؟ یا معاشرے کی خوشحالی اور اس کی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

مختلف سیاسی افکار ونظریات

مختلف سیاسی مکاتب کہ جنہیں ہم ''سیاسی افکار ونظریات'' سے تعبیر کرتے ہیں انہی سوالات کے جوابات کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہر سیاسی مکتب کی بنیاد ایک مخصوص سیاسی نظریہ (سیاسی فلسفہ) پر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ''لبرل ازم'' ایک سیاسی مکتب فکر ہے۔ وہ ان سوالات کے ایسے جواب دیتے ہیں جو بعض جہات سے دوسرے سیاسی مکتب فکر مثلاً اشتراکیت کی تعلیمات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، لبرل ازم فردی، اقتصادی اور ثقافتی آزادی کا حامی ہے اور اس نظریے کا قائل ہے کہ معاشرتی انصاف کے بہانے، ذاتی مالکیت اور اقتصادی آزادی پر قدغن نہیں لگا یا جاسکتا۔ لبرل ازم کی نظر میں حکومت کے اختیارات محدود ہونے چاہئیں۔ حکومت کا کام صرف رفاہ عامہ، امن وامان قائم کرنا اور انسانی حقوق کے بنیادی ڈھانچے کی حفاظت کرنا ہے۔ سعادت، خوش بختی، معنویات اور اخلاقیات کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ہے۔ یہ حکومت کے فرائض میں شامل نہیں ہیں۔

اس کے مقابلہ میں سوشلزم کہتا ہے: معاشرتی انصاف کا قیام حکومت کی سب سے بڑی اور اہم ذمہ داری ہے اسی لئے اقتصادی امور حکومت کے کنٹرول میں ہونے چاہئیں جبکہ ذاتی مالکیت یا تو بہت محدود ہونی چاہیئے یا پھر اس کا سرے سے ہی خاتمہ کردینا چاہیئے۔

یہاں پر دو نکات کی وضاحت ضروری ہے:

علم سیاست

(۱) علم سیاست اور سیاسی تجزیہ و تحلیل کے ساتھ مربوط بہت سے مسائل ہمیشہ جدید اور تبدیل ہوتے رہتے ہیں کیونکہ عالمی سطح پر حکومتیں اور سیاسی تعلقات بدلتے رہتے ہیں۔

اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی تبدیلیاں علاقائی اور عالمی سیاست پر اثر انداز ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں سیاسی ماہرین کو ہمیشہ نت نئے سوالات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن ''سیاسی فلسفہ'' کے متعلقہ مسائل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہ اساسی اور مخصوص مسائل ہوتے ہیں کہ جن سے سیاسی ماہرین دوچار رہتے ہیں۔

ہر سیاسی ماہر جب اپنے مخصوص نظریات کے تحت ان سوالات کا جواب دیتا ہے تو اس سے ایک سیاسی نظریہ یا مکتب تشکیل پاتا ہے۔لہٰذا ملکی یا بین الاقوامی سیاست میں تبدیلی آنے سے یہ سیاسی مکاتب تبدیل نہیں ہوتے[1]۔

سیاسی فلسفہ

(۲) ''سیاسی فلسفہ'' کے دائرہ میں بہت سے سوالات آتے ہیں، جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے کہ ان سوالات کے جو جواب دیئے جاتے ہیں انہی کی بنیاد پر سیاسی مکاتب تشکیل پاتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان کی شناخت ہوتی ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان مختلف سیاسی مکاتب میں کوئی وجہ اشتراک نہیں ہے اور سیاسی فلسفہ کے تمام مسائل کے جوابات ایک دوسرے سے بنیادی فرق رکھتے ہیں۔ممکن ہے کہ ایک سیاسی مکتب کی دوسرے سیاسی مکاتب سے علیحدگی اور امتیاز صرف ایسی ہی بعض مباحث میں ہو اور بعض دیگر جہات سے وہ دوسرے سیاسی مکاتب سے اتفاق رکھتا ہو۔مثلاً (۱) اشتراکی جمہوریت اور (۲) آزادی جمہوریت جو کہ سیاسی نظریات کے عنوان سے دو رقیب مکتب فکر ہیں، اس نقطہ پر متفق ہیں کہ جمہوریت اور رائے عامہ سیاسی حاکمیت کے جواز کی بنیاد ہے اور حکومت و حکمراں کا انتخاب عوام کی رائے کی بنیاد پر ہونا چاہئے اور ان دو مکاتب میں اختلافی نکتہ

[1] اسلام اور اس کا سیاسی نظام، ص ۴۰، السیاسۃ الشرعیۃ لإ ابن تیمیہ، ص: ۲۲

یہ ہے کہ پہلا مکتب فکر معاشرتی عدل و انصاف پر زور دیتا ہے اور دوسرا شخصی آزادی اور خصوصی مالکیت پر، ایک اشتراکی کی بات کرتا ہے اور دوسرا انفرادیت کی۔

خلاصہ سیاسی فلسفہ

(۱) ''ریاست'' انسان کی اجتماعی زندگی کا جزء لاینفک ہے، ہر معاشرہ اپنے اجتماعی امور کے نظم و تدبیر کے لئے ایک یا چند افراد کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کرتا ہے۔

(۲) ''سیاست'' یعنی معاشرتی امور کی تدبیر، ہمیشہ سے مفکرین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

(۳) ہر سیاسی مکتب اور نظریہ کی بنیاد ایک مخصوص سیاسی فلسفہ پر ہوتی ہے۔

(۴) ممکن ہے مختلف سیاسی مکاتب فکر سیاسی فلسفہ کے بعض مسائل میں ایک ہی رائے رکھتے ہوں[1]

مختلف نظامِ سیاست

اس وقت تک دنیا میں جو نظامِ سیاست معروف ہوئے ہیں، ان کو تین بڑے بڑے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔(۱) بادشاہت (۲) اشرافیہ (۳) جمہوریت، ان تین نظاموں کی مختلف شاخیں بنی ہیں۔ان تینوں کا اجمالی تعارف ضروری ہے۔

(۱) بادشاہت

شاید تاریخ عالم میں سب سے زیادہ جاری اور نافذ رہنے والا سیاسی نظام بادشاہت کا نظام ہے جو اپنی مختلف صورتوں میں شروع سے لے کر آج تک نافذ چلا آتا ہے اور تاریخ کے بیشتر حصوں میں اس کا عمل دخل زیادہ رہا ہے۔اس کی شکلیں مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں مختلف رہی ہیں، ایک جیسی نہیں رہیں۔دوسرے الفاظ میں بادشاہت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں:

پہلی قسم مطلق العنان بادشاہت

اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بادشاہ کسی دستور یا قانون کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ اُس

[1] اصول سیاست صفحہ ۲۵، اسلام اور سیاست، ص ۴۰، اسلام اور سیاسی نظریات، ص: ۱۳۵، اسلامی نظریہ حکومت، ص: ۵۰، اسلام اور اس کا سیاسی نظام، ص ۴۰، السیاسۃ الشرعیۃ لإ ابن تیمیہ، ص: ۴۰

کی زبان قانون ہوتی ہے، جو وہ کہا وہی قانون بن جاتا ہے، اور وہ اپنے احکام جاری کرنے میں کسی کے مشورے کا پابند بھی نہیں ہوتا ہے۔ اگر کسی سے مشورہ کرلے تو یہ اس کی صوابدید ہے، لیکن اگر نہ کرے تو کوئی اُس سے پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ وہ خود ہی قانون بناتا ہے، خود ہی انتظامِ حکومت چلاتا ہے، اسی نظامِ حکومت نے فرعون اور نمرود جیسے حکمران پیدا کئے جنہوں نے خدائی تک کا دعویٰ کر دیا تھا۔

دوسری قسم شورائی بادشاہت

بادشاہت کی دوسری قسم وہ ہے جس کو شورائی بادشاہت کہا جاتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بادشاہ اگرچہ خود قانون بھی بناتا ہے، اور انتظامی فیصلے بھی کرتا ہے، لیکن وہ اپنے ساتھ ایک شوریٰ بھی رکھتا ہے، اور قوانین کے اجرا میں بھی اور احکام کے اجرا میں بھی اور انتظامی معاملات میں بھی ان سے مشورے کرتا ہے۔ اب یہ شورائیں بھی مختلف نوعیت کی ہوتی رہی ہیں۔ کسی کا نام Council رکھ دیا، کسی کا نام سینیٹ رکھ دیا، کسی کا کچھ اور رکھ دیا۔

بادشاہ اپنی شوریٰ کے مشوروں کا پابند ہوتا تھا کہ انہوں نے جو مشورہ دیا ہے یا جو قرارداد پاس کر دی ہے، اب بادشاہ اسی کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ لیکن بعض ریاستوں میں بادشاہوں پر یہ پابندی نہیں ہوتی تھی کہ وہ شوریٰ کے مشوروں پر عمل کریں اور بعض ریاستوں میں یہ حدود متعین کر دی گئی تھیں کہ کن معاملات میں بادشاہ خود اپنی صوابدید سے فیصلے کر سکتا ہے، اور کن میں وہ شوریٰ کی رائے کا پابند ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً 400/300 سال پہلے کی بات ہے۔

تیسری قسم مذہبی بادشاہت

بادشاہت کی تیسری قسم مذہبی بادشاہت یعنی ایسی بادشاہت جس میں بادشاہ کے اقتدار اور اختیار کا سرچشمہ مذہب ہوتا تھا۔ مذہبی پیشوا ہی اس کی نامزدگی کی توثیق کرتے تھے کہ ہم اس کو بادشاہ مانتے ہیں، لیکن یہ بادشاہ اپنے نظامِ حکومت میں ان مذہبی پیشواؤں کا فی الجملہ تابع فرمان ہوتا تھا۔ اس مذہبی بادشاہت کا طویل رواج عیسائیوں میں رہا ہے، اور اس کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر تشریف لے جانے کے تقریباً 300 سال بعد ہوا۔

چوتھی قسم دستوری بادشاہت

دستوری بادشاہت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی بادشاہت جس میں بادشاہ کسی دستور کا پابند ہو، یہ دستوری بادشاہت بھی مختلف ادوار میں رہی ہے۔ خود یونان میں رہی، روم کی تاریخ میں بھی کچھ زمانے ایسے آئے جن میں بادشاہ خود دستور کا پابند ہوتا تھا اور بالخصوص قرونِ وسطیٰ کے بعد کے ادوار میں تو بادشاہت زیادہ تر دستوری ہی رہی۔

اسی دستوری بادشاہت کی ایک قسم وہ دستوری بادشاہت ہے جو آج کل پارلیمانی نظام کا ایک حصہ ہوتی ہے، جیسے برطانیہ میں ہے، اس وقت برطانیہ میں بادشاہ ملکہ ایلزبتھ ہے، اور وہاں دستوری بادشاہت کا نظام ہے، لیکن وہ بادشاہت برائے نام ہے۔ اختیارات اس کے کچھ نہیں ہیں۔ اصل انتظامی اختیارات سارے کابینہ کے پاس ہیں یا پارلیمنٹ کے پاس ہیں۔ محض برائے نام ایک بادشاہ رکھا ہوا ہے۔

(۲) اشرافیہ کا نظام

اشرافیہ کا نظام ہے جسے انگریزی میں ARISTOCRACY کہتے ہیں۔

اشرافیہ ایک گھڑا ہوا لفظ ہے۔ اشراف سے نکلا ہے، اشراف کہتے ہیں شریف لوگوں کو یعنی ایسے لوگ جو معاشرے میں عظمت کا کوئی مقام رکھتے ہوں، ان کو اشراف کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا خلاصہ یہ ہے، یا اس نظام کے پیچھے نظریہ یہ ہے کہ حکومت کرنا ہر انسان کے بس کا کام نہیں ہے، اور نہ اس کا حق ہر انسان کو پہنچتا ہے۔ بلکہ حکومت کرنے کا حق کچھ منتخب لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو کچھ مخصوص حسب و نسب کے مالک ہوں، یا مخصوص اوصاف کے حامل ہوں جن کو طبقۂ اشرافیہ کہتے ہیں، اشراف کے طبقے کا یہ حق ہے کہ وہ حکومت کرے، ہر کہہ ومہہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ حکومت کرے یا وہ حاکم بنے یا حاکم بننے کا مطالبہ کرے۔ بلکہ یہ حق ایک مخصوص طبقے کو حاصل ہے جس کو آپ اشراف سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب وہ طبقہ کون ہے جس کو حکومت کا حق حاصل ہے؟ اس کی تعیین مختلف لوگوں نے مختلف

طریقے سے کی ہے۔ بعض نے کہا: جو لوگ نسبی اور حسبی اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہوں وہ طبقۂ اشراف ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا: جو مذہبی طور پر ممتاز ہوں وہ طبقۂ اشراف ہیں۔ بعض نے کہا: جو کچھ مخصوص صلاحیتوں اور اوصاف کے حامل ہوں، زیادہ بہادر ہوں، زیادہ عقل مند ہوں، وہ اشراف ہیں۔

بعض نے کہا کہ جو علم کے اعتبار سے باکمال ہو، اس تصور کا آغاز درحقیقت ارسطو اور افلاطون ہی سے ہوا ہے، اور یہ اصطلاح بھی انہی کی بنائی ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ حکمرانی کا حق ایسے لوگوں کو ہونا چاہئے جو علمی صلاحیت کے اعتبار سے زیادہ ممتاز ہوں۔ لیکن یہ تصور کہ علم کی بنیاد پر لوگ حاکم بنیں، یہ تصور کبھی عملاً وجود میں نہیں آیا یہ صرف ان دونوں کا ایک دماغی تخیل تھا، ایک آرزو تھی، ایک تمنا تھی، لیکن عملاً کوئی ایسا نظام قائم نہیں ہوا جو خالصتاً علمی بنیادوں پر حکومت کا انتخاب کرے۔

اشرافی نظام کی بھی کئی قسمیں ہیں:

علمی اشرافیہ

ایک قسم تو علمی اشرافیہ کی تھی جس کا تصور ارسطو اور افلاطون نے پیش کیا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ محض ایک آرزو تھی جو کبھی وجود میں نہیں آئی۔

نسلی اشرافیہ

دوسری قسم نسبی یا نسلی اشرافیہ کہلاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک نسل کا تعین کرلیا جائے کہ صرف اس نسل یا قبیلے کے لوگ حکمرانی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اب جو بھی حکمراں آئے گا وہ اس نسل کا آئے گا۔ اس پر بہت سی قوموں میں بکثرت عمل ہوتا رہا ہے۔ خاص طور سے ہندو تہذیبوں میں اس کا خاص تصور تھا کہ حکومت کرنا برہمن یا راجپوت یا کھشتری نسلوں ہی کا حق سمجھا تھا۔

مذہبی اشرافیہ یا تھیوکریسی

تیسری قسم مذہبی اشرافیہ ہے جس کو تھیوکریسی (Theocracy) بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا اصل تصور تو بڑا مبارک ہے، اور وہ یہ کہ درحقیقت اس کائنات میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے،

اور یہاں جو بھی حکومت قائم ہوا، اسے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنی چاہئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا تعین کون کرے؟ عیسائی دنیا میں اس کا عملی جواب یہ تھا کہ چرچ کا سربراہ جو پوپ کہلاتا تھا، اسی کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا تعین کرکے بادشاہ کو بتائے، چنانچہ جس بات کو پوپ اللہ تعالیٰ کا حکم قرار دیدے، حکومت کا سربراہ اُسی پر عمل کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عملاً تھیوکریسی کا مطلب مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت ہوگیا۔ چنانچہ اب جو تھیوکریسی کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو بکثرت ''خدا کی حاکمیت'' کے بجائے ''مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت'' کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔

(۳) جمہوریت کی حقیقت

جمہوریت ایک یونانی اصطلاح ہے جو دو الفاظ "demo" یعنی عوام اور "cracy" یعنی حکومت سے مرکب ہے۔ عوامی حکومت یا عوام قیادت اپنے دقیق معنی کے ساتھ تو ایک ایسا خواب ہے جو کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ جمہوری حکومتوں میں کچھ افراد لوگوں کی اکثریت رائے سے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور درحقیقت عملی طور پر یہی افراد حکومت کرتے ہیں نہ کہ عوام۔

البتہ قدیم یونان کے شہروں کی حکومتوں میں بہت سارے فیصلے شہر کے چوک میں کھلے عام اور لوگوں کی رائے سے انجام دئے جاتے تھے لیکن وہاں بھی تمام لوگوں کو رائے دہی کا حق نہیں تھا کیونکہ خواتین اور غلام رائے نہیں دے سکتے تھے۔

جمہوریت کی وضاحت

ڈیموکریسی یعنی جمہوریت ایک ایسا کلمہ ہے جس کی مختلف تفسیریں اور معانی کئے گئے ہیں۔ اس مدعی کی دلیل یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر نے بالکل متضاد نظریات کے باوجود جمہوریت کی حمایت کی ہے۔ لبرل ازم اور فاشزم کے حامی اور قدامت پسند سبھی خود کو جمہوریت نواز کہتے ہیں اور اپنے آپ کو حقیقی جمہوریت قائم کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ اشترا کی جمہوریت، لبرل ازم، آزاد

جمہوریت، صنعتی جمہوریت اور کثیر الرائے جمہوریت جیسی مختلف اصطلاحیں حقیقت میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جمہوریت سے مراد کوئی مخصوص معنی اور اصطلاح نہیں ہے۔ جمہوریت کا کوئی ثابت معنی نہیں ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں مختلف جمہوری حکومتیں قائم ہیں اور جمہوریت مختلف سیاسی نظریات کے ساتھ ہم ساز و ہم آہنگ ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جمہوریت کا کوئی ایسا معنی موجود نہیں ہے کہ جس پر سبھی متفق ہوں۔ جمہوریت نے مختلف معاشروں کے اجتماعی تغیرات کے ساتھ ساتھ مختلف روپ ڈھالے ہیں۔

جمہوریت کی ابتداء

جمہوریت کی ابتداء کا تصور یہ تھا کہ بادشاہ خاص خاص بڑے بڑے فیصلوں کے سلسلہ میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے ساری آبادی کو اکٹھا کر لیتا تھا۔ ساری آبادی کسی ایک میدان میں اکٹھی ہو جاتی تھی، اور ان کے سامنے ایک بات رکھی جاتی تھی کہ ہم یہ کام کرنا چاہتے ہیں یا یہ پالیسی بنانا چاہتے ہیں، آپ کی کیا رائے ہے؟ کچھ لوگوں نے کھڑے ہو کر تائید کر دی اور کچھ لوگوں نے تردید کر دی، کچھ بحث و مباحثہ بھی ہو گیا، آخر میں لوگوں سے ہاتھ کھڑے کر کے اس بات پر منظوری لے لی گئی۔ وہاں جمہوریت کا نظام اتنا ہی سادہ تھا۔ اس کے لئے کوئی خاص ایسا دستور نہیں تھا کہ فلاں معاملے میں منظوری لی جائے گی، اور فلاں معاملے میں نہیں لی جائے گی اور فلاں معاملے میں بادشاہ کو بغیر منظوری کے کام کرنے کا حق ہوگا، اور فلاں معاملے میں نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ نکلا کہ جمہوریت کا یہ تصور کہ عوام کو پالیسیوں میں حصہ دار بنایا جائے، عملاً مفقود ہوتا چلا گیا، اور اس کی جگہ مطلق العنان بادشاہت وغیرہ نے لے لی[1]۔

جمہوریت کا دوسرا دور

مغربی دنیا میں جمہوریت کی صورت گری جن مفکرین نے کی، اور جن کو جدید آزاد خیال کا بانی سمجھا جاتا ہے، وہ تین فلسفی ہیں جنہوں نے Liberal Democracy کی داغ بیل ڈالی،

[1] اصول سیاست صفحہ ۵۰، اسلام اور سیاست، ص ۱۱۳، اسلام اور سیاسی نظریات، ص: ۱۵۰، اسلامی نظریہ حکومت، ص: ۱۳۸، اسلام اور اس کا سیاسی نظام، ص ۲۴۰، السیاسۃ الشرعیۃ لإ ابن تیمیہ، ص: ۱۳۸

ایک وولٹائر (Voltire) دوسرا مونٹیسکو (Montesquiue)، تیسرا روسو (Rousseau) یہ تین افراد ہیں جنہوں نے اپنے اپنے نظریات اور فلسفے کی بنیاد پر ایسے افکار دنیا میں پھیلائے جس کے نتیجے میں جمہوریت وجود میں آئی۔ یہ تینوں شخص فرانس کے ہیں۔

وولٹائر کا نظریہ

ان میں جو سب سے پہلا شخص ہے، یعنی وولٹائر، یہ 17 ویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا تھا، اور 18 ویں صدی میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے فلسفے، سائنس اور آرٹ کے ہر شعبے میں کئی کتابیں لکھی ہیں اور اس کی تحریروں کا مجموعہ تقریباً 90 جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ وولٹائر نے دعویٰ کیا کہ جتنے آسمانی مذاہب ہیں، سب تحریف شدہ ہیں، اور اصل میں انسان کا ایک ہی مذہب ہونا چاہئے، اور وہ فطری مذہب ہے۔ اس کو انگریزی میں Natural Religion کہتے ہیں۔

وولٹائر کے نظریات کی دوسری بات جو سب سے زیادہ مؤثر ہوئی، وہ یہ کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے، اور کوئی اتھارٹی دوسرے کو کسی مذہب کے حق اور باطل ہونے کا قائل نہیں کر سکتی۔ بلکہ یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے، وہ اگر چاہے تو بت پرستی کرے، اور اگر چاہے تو آسمانی مذہب اختیار کرے، اور چاہے تو یہودی بن جائے یا عیسائی بن جائے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں نہ چرچ کو دخل اندازی کی ضرورت ہے اور نہ حکومت یعنی State کو، حکومت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب یہ بات طے ہو گئی کہ مذہب ذاتی معاملہ ہے، اور ذاتی تسکین کا ذریعہ ہے، اس لئے اس کا ریاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اسی سوچ کی بنیاد پر سیکولرازم کا نظریہ پیدا ہوا۔ سیکولرازم اس کا لفظی معنیٰ "دنیاوی" ہیں۔ سیکولر کہتے ہیں ہر اس چیز کو جو دنیاوی مصالح اور دنیاوی منافع کے لئے بنائی گئی ہو، یا جس میں کوئی دنیاوی مصلحت ہو۔ یعنی یہ ایک ایسا نظام ہے جو صرف دنیاوی فائدوں کے لئے وضع کیا گیا ہے، اور جو خالصتاً دنیاوی منافع و مصالح کو پیش نظر رکھتا ہے، اس لئے اس کا لازمی نتیجہ لادینیت ہوتا ہے۔ ریاست کے تعلق سے سیکولرازم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ریاست خالصتاً دنیاوی منافع و مصالح کے تحت چلنی چاہئے، کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ سارا فلسفہ وولٹائر کے نظریات پر مبنی ہے۔

مونٹیسکو کا نظریہ

دوسرا شخص جس کا جمہوریت کی صورت گری میں بڑا کردار ہے مونٹیسکو (Montesquiue) ہے۔ اس کی صرف ایک کتاب مشہور ہے جس کا نام ہے روحِ قانون (Spirit of Law) یہ کتاب تقریباً چار سو صفحے کی ہے، جمہوریت کے سلسلے میں اس کا ایک نظریہ ہے جو تفریق اختیارات کا نظریہ کہلاتا ہے، اور جسے انگریزی میں "Separation of power" کہتے ہیں۔ مونٹیسکو نے پہلی بار یہ بات کہی کہ ریاست کے اختیارات درحقیقت تین مختلف قسم کے اختیارات ہیں:

(۱) قانون سازی کا اختیار (۲) ملک کا انتظام اُس قانون کے مطابق چلانے کا اختیار (۳) اگر کوئی شخص قانون کے خلاف کوئی کام کرے، یا اس معاملے میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے کہ یہ کام قانون کے دائرے میں ہے یا نہیں، تو اس تنازعہ کا فیصلہ کرنے کا اختیار۔

مونٹیسکو کے تفریق اختیارات کے نظریے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں اختیارات کسی ایک شخص یا ادارے میں مرتکز نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ یہ تینوں ادارے ایک دوسرے سے آزاد اور خود مختار ہونے چاہئیں، اور ایک ادارے کو دوسرے ادارے کے کام میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔

چنانچہ قانون سازی کا اختیار جس ادارے کو حاصل ہو، اُس کا نام مقنّنہ (Legislature) ہے اور جمہوریت میں یہ اختیارات پارلیمنٹ یا اسمبلی کو حاصل ہوتے ہیں۔ قانون کے مطابق ملک کا انتظام چلانے کا اختیار جس ادارے کو حاصل ہوتا ہے، اسے انتظامیہ یا ایگزیکٹو (Executive) کہا جاتا ہے جس کا سربراہ صدارتی نظام میں صدرِ مملکت اور پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم ہوتا ہے۔

تیسرا اختیار یعنی قانون کی تشریح اور تنازعات کا تصفیہ جو ادارہ کرتا ہے، اُسے عدلیہ یا جوڈیشری (Judiciary) کہا جاتا ہے، اور جو ملک کی عدالتوں کی شکل میں وجود میں آتا ہے۔

مونٹیسکو کا کہنا یہ تھا کہ ماضی میں یہ تینوں قسم کے اختیارات ایک شخص یا ایک جہت میں مرکوز ہوتے تھے، وہی قانون بناتی تھی، وہی انتظام کرتی تھی، اور وہی تنازعات کا تصفیہ کرتی تھی۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ اگر انتظامیہ کوئی گڑبڑ کرے تو اس کے خلاف فریاد بھی اُسی کے پاس لے جانی پڑتی تھی۔

اس سے مطلق العنانی بڑھتی تھی۔ اس نظریہ کو بعد میں تمام جمہوریتوں نے تسلیم کیا، اور اگر کسی ریاست کے جتنے دستور بنتے ہیں، وہ اسی بنیاد پر بنتے ہیں کہ مقنّنہ کے الگ اختیارات ہوتے ہیں، اور انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات الگ ہوتے ہیں۔

روسو کا نظریہ

تیسرا شخص جس نے جمہوریت کی صورت گری میں حصہ لیا وہ روسو (Rousseau) ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے معاہدۂ عمرانی کے نظریہ کی تجدید کی ہے۔ معاہدۂ عمرانی کا تقاضا یہ ہے کہ عوام اپنی نمائندہ حکومتیں قائم کریں، اور فرد کے مفادات کا تحفظ کریں۔ اس طرح روسو کے نظریے میں دو چیزیں ہیں: ایک فرد کی آزادی پر زور دینا۔

اور دوسرے افراد کی نمائندہ حکومت، یعنی افراد کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ جب چاہیں کوئی حکومت بنائیں، اور جب چاہیں، ختم کر دیں۔

یہ تین بنیادی نظریات ہیں جنہوں نے آزاد خیال اور سیکولر جمہوریت کی صورت گری کی ہے[۱]۔

جمہوریت کے زیرِ اثر قائم ہونے والے ادارے

جو ادارے جمہوریت کے زیر اثر قائم ہوتے ہیں ان میں چار ادارے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

(۱) سیاسی جماعتیں (۲) انتخابات (۳) مقنّنہ (۴) دستور

(۱) سیاسی جماعتیں

جمہوریت کے بنیادی نظریات اور افکار میں یہ بات داخل ہے کہ مملکت کے تمام باشندوں کی جماعت یا انجمن بنانے کا حق حاصل ہے، اور کسی گروہ یا جماعت پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ اس طرح کسی بھی ملک میں جو انجمنیں یا جماعتیں قائم ہوتی ہیں وہ تین قسم کی ہوتی ہیں:

۱؎ اصول سیاست صفحہ ۹۵، اسلام اور سیاست، ص ۱۱۸، اسلام اور سیاسی نظریات، ص: ۲۳۵، اسلامی نظریہ حکومت، ص: ۱۳۸، اسلام اور اس کا سیاسی نظام، ص ۱۴۵

۱- مشترک مفاد کے حصول کی انجمن (Interest Group)

یعنی وہ جماعت جو مشترک مفاد اور مقصد حاصل کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی ہو۔ مثلاً خاص پیشے کے لوگ اپنے حقوق کے تحفظ یا امداد باہمی کے لئے کوئی جماعت بنالیں۔ اس جماعت کا اقتدار یا حکومت حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ وہ جماعت غیر سیاسی مقاصد کے لئے بنائی جاتی ہے۔ علم سیاست کی اصطلاح میں ایسی جماعت کو ''انٹرسٹ گروپ'' یا ''مشترکہ گروپ'' کہا جاتا ہے۔

۲- پریشر گروپ (Pressure Group)

اس جماعت اور گروپ کا مقصد اقتدار اور حکومت کا حصول نہیں ہوتا، لیکن اس کا مقصد حکومت سے باہر رہ کر حکومت پر دباؤ ڈالنا ہوتا ہے کہ ہمارا فلاں مطالبہ منظور کرو، یا ہماری پالیسی کو اپنی پالیسی کا حصہ بناؤ۔

۳- سیاسی جماعت (Political Group/Party)

اس جماعت اور ان افراد کے مجموعے یا گروہ کا نام ہے جو کسی خاص پالیسی کو نافذ کرنے کے لئے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہو۔ جمہوریت میں سیاسی پارٹی بنانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ پہلے یہ سوچتے ہیں کہ ملک کے لئے کس قسم کی معاشی یا معاشرتی پالیسی مفید ہوسکتی ہے۔ پھر اس کو عمل میں لانے کے لئے وہ اپنا ایک منشور تیار کرتے ہیں کہ اگر ہم برسر اقتدار آگئے تو ملک کو اس منشور کے مطابق چلائیں گے۔ منشور اس دستاویز کا نام ہے جو ایک سیاسی جماعت اپنے مقصد بیان کرنے کے لئے تیار کرتی ہے کہ برسر اقتدار آنے کے بعد وہ ملک کو کس طرح چلائے گی۔ پھر وہ دوسرے لوگوں کو اس منشور سے متفق کر کے ان کو پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دیتی ہے۔

مختلف ملکوں میں سیاسی جماعتیں

مختلف ملکوں میں سیاسی جماعتوں کے مختلف نظام رائج ہیں۔ بعض ملکوں میں صرف ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے، اس کو ''ایک جماعتی نظام'' (One Party System) کہا جاتا ہے۔ اکثر کمیونسٹ ممالک میں یہی نظام رائج ہے، وہاں دوسری پارٹی وجود میں نہیں آسکتی۔ دوسری پارٹی بنانا ممنوع ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں دو جماعتی نظام رائج ہے۔ ایسے ممالک میں قانوناً تو یہ پابندی نہیں

ہوتی کہ دو سے زیادہ جماعتیں وجود میں نہ آئیں۔ لیکن متعدد انتخابات کے نتیجے میں چھوٹی چھوٹی پارٹیاں یا تو بالکل ختم ہوجاتی ہیں، یا اتنی غیر مؤثر ہوجاتی ہیں کہ عملاً یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ملک میں درحقیقت دو ہی جماعتیں قابلِ ذکر ہیں، ان میں سے کبھی ایک جماعت حکومت میں آجاتی ہے، اور کبھی دوسری جماعت برسر اقتدار آجاتی ہے، امریکا اور برطانیہ میں یہی صورتحال ہے۔

بعض ممالک میں ''کثیر الجماعتی نظام'' رائج ہے، وہاں چھوٹی بڑی بہت سی پارٹیاں ہوتی ہیں، اور وہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتی رہتی ہیں، لیکن پہلے سے پیشنگوئی کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی جماعت برسر اقتدار آئے گی۔ جیسے ہندوستان وغیرہ میں۔

(۲) انتخابات

جمہوری نظام میں یہ ضروری ہے کہ حکومت انتخابات کے نتیجے میں برسر اقتدار آئے۔ عام طور سے جمہوریت میں انتخابات کے دو طریقے ہیں:

(۱) بلاواسطہ یا براہ راست انتخاب (۲) بالواسطہ انتخاب

(۱) بلاواسطہ یا براہ راست انتخاب

''براہ راست انتخاب'' کا مطلب یہ ہے کہ ہر بالغ باشندے کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا جائے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل اور جو امیدوار اپنے حلقے کے باشندوں کے زیادہ ووٹ حاصل کرلے وہ منتخب ہوجائے۔

(۲) بالواسطہ انتخاب

''بالواسطہ انتخاب'' کا مطلب یہ ہے کہ عوام اپنے ووٹوں کے ذریعہ انتخاب کرنے والوں کا انتخاب کریں۔ یعنی عوام پہلے ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو پارلیمنٹ کے ارکان منتخب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، پھر وہ منتخب شدہ افراد مقنّنہ کے لئے ممبران کا انتخاب کریں۔

(۳) مقنّنہ (Legislarure)

جمہوریت کا قائم کردہ تیسرا ادارہ ''مقنّنہ'' کہلاتا ہے، یہ جمہوریت کے نظام میں سب سے

زیادہ اہمیت رکھتا ہے، ''مقنّنہ'' کے لفظی معنی ہیں ''مجلس قانون ساز'' یعنی قانون بنانے والی مجلس، اس ادارے کو ''پارلیمنٹ یا ''اسمبلی'' کے معنی ہیں ''پارلیمنٹ'' کے معنی ہیں وہ جگہ جہاں لوگ بیٹھ کر مباحثہ کریں، اور ''اسمبلی'' کے معنی ہیں ''اجتماع گاہ''، اس ادارے کا بنیادی کام قانون سازی ہے، ملک کے اندر کیا قانون نافذ ہونا چاہئے؟ اس پر یہ ادارہ بحث کرتا ہے، پھر جس قانون کو اکثریت کی حمایت حاصل ہو جائے، اسے منظور کر کے نافذ بھی کرتا ہے، اس کے علاوہ یہ ادارہ حکومت کی پالیسیوں پر بھی بحث کرتا ہے، اور جمہوری نظام میں اسے سب سے بالاتر ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔

مقنّنہ کے دو نظام

پھر جمہوری نظام کے اندر مقنّنہ کے دو قسم کے نظام مشہور ہیں:

(۱) ایک ایوانی مقنّنہ کا نظام (Unicameral)

(۲) دو ایوانی مقنّنہ کا نظام (Bicameral)

(۱) ایک ایوانی مقنّنہ کا نظام

ایک ایوانی مقنّنہ کا نظام بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ ملک میں حکومت چلانے کے لئے ایک مقنّنہ وجود میں آ گئی، وہی قانون سازی کرتی ہے، اور جو قانون بھی وہ منظور کر دے وہ قانون میں نافذ ہو جاتا ہے۔

(۲) دو ایوانی مقنّنہ کا نظام

دو ایوانی مقنّنہ کے نظام میں ایک ایوانِ زیریں ہوتا ہے اور ایک ایوان بالا کہلاتا ہے۔

ایوانِ زیریں

جیسے برطانیہ میں ''دارالعوام'' انڈیا میں ''لوک سبھا'' امریکہ میں ''کانگریس''۔

ایوان بالا

جیسے برطانیہ میں ''دارالامراء'' انڈیا میں ''راجیہ سبھا'' امریکہ میں ''سینیٹ''۔

دو ایوانوں کی ضرورت

سوال یہ ہے کہ دو ایوانوں کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایوان زیریں میں نمائندے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اور عموماً جماعتی نظام کے تحت منتخب ہو کر آجاتے ہیں، صلاحیت کی بنیاد پر منتخب نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے ان میں جذبات زیادہ ہوتی ہے، وہ اپنی سیاسی جماعت کے دباؤ کی وجہ سے ان میں جذباتیت زیادہ بعید نہیں کہ وہ جذبات میں آ کر کوئی ایسا قانون طے کر دیں جو ملک کے لئے فائدہ مند نہ ہو۔

لہٰذا ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جس کی تشکیل ایوان زیریں سے مختلف طریقے پر ہو، اور جو قانون ایوان زیریں پاس کرے، اس قانون پر دوبارہ اس ایوان بالا میں گفتگو ہو، اور پھر غور و فکر کے بعد اس قانون کو نافذ کیا جائے، تاکہ کوئی قانون جلد بازی میں اور جذباتیت کے تحت نہ بن جائے۔ چنانچہ اصل تصور یہ تھا کہ جس موضوع پر قانون سازی کی جارہی ہے اس موضوع کا کوئی ماہرین بعض اوقات ایوان زیریں میں نہیں ہوتا، لہٰذا ایوانِ بالا میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو لیا جائے، تاکہ جب ایوان زیریں کوئی قانون بنا کر پاس کر دے تو اب یہ ماہرین ایوان بالا میں اس قانون پر نظر ثانی کریں، اور فنی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیں، اگر اس میں ترمیم ضروری سمجھیں تو ایوان زیریں کو ترمیم کا مشورہ دیں۔

دوسری وجہ جواز

ایوان بالا کی دوسری وجہ جواز یہ بیان کی جاتی ہے کہ جو ملک ایک سے زائد صوبوں پر مشتمل ہیں، اور ان صوبوں میں علاقائی یا ثقافتی یا لسانی اختلافات موجود ہیں، ظاہر ہے کہ ان میں کوئی صوبہ چھوٹا ہوگا، کوئی صوبہ بڑا ہوگا، اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ بڑے صوبے کے نمائندہ افراد کوئی ایسا قانون پاس کرالیں جو چھوٹے صوبوں کے مفادات کے خلاف ہو، اور چھوٹے صوبے کے نمائندے چونکہ اقلیت میں ہوتے ہیں اس لئے ان کی رائے مسترد ہو جائے۔ اس لئے ایک ایوان بالا ایسا ہونا چاہئے جس میں تمام صوبوں کی نمائندگی برابر ہو، آبادی کی بنیاد پر نہ ہو، تاکہ وہاں بڑے

صوبے کے نمائندے اپنی من مانی نہ کرسکیں، اور اس وقت دنیا کے جن ممالک میں دو مقنّنہ ہیں، وہ زیادہ تر اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے ہیں، تاکہ وہاں چھوٹے صوبے کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔

دوسرا ایوانِ بالا

دوسرا ایوانِ بالا اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ چھوٹے صوبوں کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے اور نام کے اعتبار سے وہ ''ایوانِ بالا'' ہے، لیکن یہ ایوانِ بالا اپنے اختیارات کے اعتبار سے بہت کمزور ہوتا ہے، اور ایوانِ بالا ہونے کے باوجود حقیقت میں وہ ایوانِ زیریں سے بہت کم تر ہوتا ہے، چنانچہ اکثر و بیشتر ملکوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایوان زیریں جو قانون پاس کردیتا ہے، پھر وہ قانون ایوانِ بالا میں پیش کیا جاتا ہے، غور و فکر کے بعد ایوانِ بالا کے افراد اس قانون کو اگر درست نہ سمجھیں تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ وہ دوبارہ غور کرنے کے لئے ایوانِ زیریں کو واپس کردیں، لیکن اس قانون کو رد نہیں کرسکتے چنانچہ دوبارہ غور کرنے کے بعد ایوانِ زیریں اسی قانون کو پاس کردے تو اب وہ قانون منظور ہوجائے گا، دوبارہ ایوانِ بالا میں پیش نہیں کیا جائے گا۔

جمہوری نظام میں ''مقنّنہ'' سب سے اعلیٰ ترین ادارہ سمجھا جاتا ہے، اور جمہوریت کے مذہب میں ''مقنّنہ'' کو معصوم عن الخطا تصور کیا جاتا ہے، گویا اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ البتہ اس بارے میں امریکی اور برطانوی نظام میں فرق ہے۔ برطانوی نظام میں پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے کسی قانون کو یا اس کے کسی اقدام کو ملک کے کسی ادارے میں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ پارلیمنٹ سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ جبکہ امریکی نظام میں ''پارلیمنٹ'' اگرچہ بااختیار ادارہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر پارلیمنٹ کوئی قانون پاس کردے اور کوئی شخص اس قانون کو دستور کے خلاف یا بنیادی حقوق کے خلاف سمجھے تو وہ اس قانون کو عدالت میں چیلنج کرسکتا ہے، اور اگر عدالت اُس قانون کو ملکی آئین یا بنیادی حقوق کے خلاف قرار دیدے تو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو کالعدم کرسکتی ہے۔ اس کو عدالتی نظرِ ثانی (Judicial Review) کا نظام کہا جاتا ہے۔

(۴) دستور

جمہوری حکومت اور مطلق العنان حکومت کے درمیان یہی بنیادی فرق ہوتا ہے کہ مطلق العنان

حکومت کسی دستور کی پابند نہیں ہوتی، جبکہ جمہوری نظام میں حکومت اس بات کی پابند ہے کہ وہ اپنا نظامِ حکومت دستور کے مطابق چلائے۔

پھر دستور دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) وحدانی دستور (۲) وفاقی دستور

وحدانی دستور (Unitary)

وحدانی دستور کا مطلب یہ ہے کہ پورے ملک کے لئے ایک ''مقنّنہ'' ہوگی اور اس کی جو علاقائی وحدتیں ہیں، چاہے وہ صوبوں کی شکل میں ہوں یا ضلعوں کی شکل میں، یا ریاستوں کی شکل میں ہوں، ان وحدتوں کی کوئی علیحدہ حکومت اور مقنّنہ نہیں ہوتی، بلکہ پورے ملک کی ایک ہی حکومت، ایک ہی مقنّنہ ایک ہی انتظامیہ، ایک ہی عدلیہ ہوتی ہے، اور پورے ملک کا نظام مرکز سے چلتا ہے اور تمام علاقے اسی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں، اور انتظامی وحدتوں مثلاً صوبوں، ضلعوں اور ریاستوں وغیرہ کے انتظام چلانے کے لئے سرکاری ملازمین کو مقرر کیا جاتا ہے۔ جیسے شہر کے انتظام کے لئے ''کمشنر یا ڈپٹی کمشنر'' ہوتا ہے، وہ شہر کا حاکم تصور کیا جاتا ہے، وہ سیاسی حکمران نہیں ہوتا، بلکہ سرکاری ملازم ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کئی صوبے ہیں تو ہر صوبے میں سرکاری ملازم وہاں نظام چلاتا ہے۔ لیکن نہ اس کی علیحدہ اسمبلی ہوتی ہے، اور نہ کوئی کابینہ، اور نہ اس کا علیحدہ کوئی سیاسی وجود ہوتا ہے۔ یہ وحدانی دستور کا طریقہ کار ہے۔ عام طور پر یہ نظام ان ممالک میں جاری کیا جاتا ہے جہاں صوبے زیادہ نہ ہوں، یا جس ملک کے تمام لوگ ایک ہی نظریئے کے حامل ہوں۔ چونکہ ان میں آپس کے مفادات کا ٹکراؤ نہیں ہوتا، اس لئے وہاں وحدانی دستور اختیار کیا جاتا ہے۔

وفاقی دستور

وفاقی دستور وہاں نافذ ہوتا ہے جہاں ایک ملک میں متعدد علاقائی وحدتیں موجود ہوں۔ وفاقی حکومت کا اصل تصور تو اس طرح پیدا ہوا تھا کہ شروع میں ہر علاقائی وحدت کی اپنی الگ حکومت تھی۔ دوسرے الفاظ میں ہر صوبہ ایک مستقل ملک کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن بعد میں ان حکومتوں نے مل کر

ایک اتحاد قائم کرلیا جو وفاق کہلایا۔اس طرح ایک مرکزی حکومت ہوگئی جو وفاقی حکومت کہلائی،اور ہرصوبے کی ایک ذیلی حکومت الگ قائم رہی،اوراُنہوں نے اپنے درمیان اختیارات تقسیم کر لیئے[۱]۔

نوٹ: پیچھے عرض کیا گیا تھا کہ دوقسم کے دستور ہوتے ہیں،ایک وحدانی اور دوسرا وفاقی،ہر ملک اپنے حالات کے لحاظ سے دستور کی ترتیب وتدوین مختلف طریقوں سے کرتا ہے۔

دستور کے بنیادی حقوق پانچ ہیں

دستور کا سب سے اہم حصہ جوآج کے جمہوری دساتیر میں عموماً موجود ہوتا ہے،وہ بنیادی حقوق (Fundametal Rights) کا حصہ کہلاتا ہے اور جمہوری دساتیر اس بات پر سب سے زیادہ فخر کرتے ہیں کہ ہمارے جمہوری نظام میں انسان کے بنیادی حقوق کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔مطلق العنان بادشاہتوں یا حکومتوں میں افراد کے بنیادی حقوق کا کوئی تحفظ نہیں تھا۔لیکن ہم نے یہ حقوق انسانوں کو فراہم کئے چنانچہ دستور کے اندران بنیادی حقوق کا ذکر ہوتا ہے جو تمام افراد کو حاصل،ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) پہلا دستور میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا یا حکومت کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گی جو فرد کی جان و مال یا آبرو پر حملہ آور ہو۔

(۲) دوسرا ہر فرد کے اس حق کا اعلان کیا جاتا ہے کہ ہر فرد کو اظہار رائے کی مکمل آزادی ہے۔جو بھی اس کی رائے ہو،وہ اس کو برملا اظہار کرے،اور اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

(۳) تیسرا یہ کہ ہر فرد کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے وہ جس مذہب کو اپنے لئے برحق سمجھتا ہے اس پر وہ عمل کرے۔

(۴) چوتھا ہر شخص کو جماعت سازی کی آزادی ہے کہ وہ جس طرح چاہے، جماعت بنائے،انجمن بنائے۔

(۵) پانچواں حق یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی املاک کی تحفظ کی آزادی ہے۔لہٰذا اس کی املاک

[۱] اصول سیاست صفحہ۱۲۲،اسلام اور سیاست ص۱۱۵،اسلام اور سیاسی نظریات ص:۳۱۵،اسلامی نظریہ حکومت ص:۲۳۸، اسلام اور اس کا سیاسی نظام ص۱۴۰

پر کوئی دوسرا حملہ آور نہیں ہوگا۔ہر شخص کو اپنے لئے حکمران منتخب کرنے کی آزادی ہے لہٰذا وہ حکمران اپنی مرضی کے مطابق منتخب کرنے کے لئے بھی آزاد ہے،اور ووٹ کا حق استعمال کرسکتا ہے۔اس قسم کے حقوق ہیں جو بنیادی حقوق کے باب میں درج ہیں۔

بنیادی حقوق کی ابتداء

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے بنیادی حقوق کی دستاویز برطانیہ کے بادشاہ جان دوم نے تیرہویں صدی میں تیار کی تھی۔اس کو Magna Katra کہتے ہیں، جان دوم نے اپنے باشندوں کے لئے ایک دستاویز لکھی تھی جس میں لوگوں کو حقوق دینے کا پیمان تھا،اور یہ بہت ہی مشہور دستاویز ہے اکثر وبیشتر اس کے حوالے آتے ہیں اور برطانیہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے بنیادی حقوق کو متعارف کرانے میں ہمارا حصہ ہے کہ ہم نے اور ہمارے بادشاہ نے یہ دستاویز میگنا کارٹا جاری کی تھی۔لیکن اگر اس دستاویز کو دیکھا جائے تو اس میں انسان کے بنیادی حقوق کے بارے میں صرف ایک جملہ ہے،اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو قانون کے بغیر گرفتار نہیں کیا جائے گا اور مقدمہ چلائے بغیر اس کو سزا نہیں دی جائے گی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قبل یہ تصور نہیں تھا کسی شخص کو گرفتار کرنے کے لئے کسی قانون کی ضرورت ہے اور Magna Karta کی باقی جتنی دفعات ہیں ان میں چرچ کو آزادی ہے کہ چرچ حکومت سے آزاد ہوگا،اس میں ٹیکس لگانے کی آزادی کہ ٹیکس حکومت لگا سکے گی،اور اس کے اصول یہ ہونگے وغیرہ وغیرہ۔لیکن انسان کے حقوق سے متعلق صرف ایک دفعہ ہے،اور وہ اسی بنیاد پر شور مچایا ہوا ہے کہ ہم نے انسان کو بنیادی حقوق فراہم کئے ہیں،جب کہ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں جو حقوق عطا فرمائے،وہ اتنے واضح اور جامع ہیں کہ Magna Karta وغیرہ ان کے غبار کو بھی نہیں پہنچتے۔

بنیادی حقوق کے موجد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

قرآن کریم نے انسانی حقوق کی وضاحت کی ہے اور درحقیقت اسلام نے تو انسانی بنیادی

حقوق کا روز اول سے اعلان کیا ہوا تھا لیکن یہ لوگ آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے ہیں یا قصداً تجاہل سے کام لیکر اس کا ذکر نہیں کرتے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے بنیادی حقوق Magna Karta نے بنائے۔ میگنا کا دستاویز صرف بیالیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں صرف ایک دفعہ کے سوا انسانی بنیادی حقوق سے متعلق کوئی اور بات نہیں ہے۔ اس کے بعد جو حقوق مزید وضاحت کے ساتھ امریکہ کے اعلان آزادی میں شامل کئے گئے، ان کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ کا جملہ ہے، یعنی انسان ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوا ہے اسے غلام بنانے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی جملہ ہے جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ:

"**مذکم اعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم أحراراً.**"[1]

"یعنی تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا؟"

اور حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم کے دربار میں جو تقریر کی تھی، اس میں اس سوال و جواب میں کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ تو کیوں یہاں پر آئے ہو؟ فرمایا تھا کہ: "ہم لوگوں کو بتوں کی غلامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی غلامی میں لانا چاہتے ہیں[2]۔"

حقیقت میں بنیادی حقوق تو وہ حضرات دے گئے تھے۔ لیکن اس کا یہ لوگ کہیں بھی ذکر نہیں کرتے، اور ان کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ کئے بغیر یہ لوگ بنیادی انسانی حقوق کی تاریخ کرتے ہوئے سب سے پہلے Magna Karta کا ذکر کرتے ہیں[3]۔

☆☆☆

[1] کنز العمال، ج۳، ص۱۵ [2] البدایہ والنہایہ، ج۳، ص۳۸

[3] اسلام اور سیاسی نظریات، ص: ۳۴۰، اسلامی نظریہ حکومت، ص: ۲۳۸، اسلام اور اس کا سیاسی نظام، ص۱۵۵